فطرت کی بولی سیکھتے تھے' بھوک پیاس سہتے تھے۔ پھر جب مستی پہرہ مجاہدہ' مشقت' خود اذیتی کا باب ختم ہو جاتا پھر انہیں خلق کی طرف لوٹا دیا جاتا۔ یہی کچھ خاں صاحب کے ساتھ ہوا۔ پہلے وہ اپنے اندر گم ہوئے۔ اندر اندھے کنوئیں میں گرے رہے۔ پھر انہیں خلق کی طرف لوٹا دیا گیا۔

خاں صاحب کے چھ بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ جس طرح آج لوگ نیویارک دیکھے بغیر اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں اسی طرح 1- مزنگ روڈ دیکھے بغیر میں اس کے طلسماتی سحر میں مبتلا ہو گئی۔ خاں صاحب کی سب سے بڑی بہن فرخندہ آپا تھیں۔ دراز قد' کھلے کھلے ہاتھ پاؤں والی گوری چٹی مردانہ وجاہت' لیکن بڑی نرم دل خاتون جو زندگی کو ساری عمر رو رو کر گزارتی رہیں۔ اُن کی آنکھ میں بڑا لحاظ تھا۔ وہ خود بھی رسالہ ''مخزن'' اور ''عصمت'' میں مضمون لکھتی رہی تھیں اور انہوں نے ہی اشفاق احمد کو سیٹی پر لگا کر افسانہ نگاری کی طرف مائل کر دیا تھا۔ وہ مسلمانوں میں اور خاص طور پر عورتوں میں مذموم رسم و رواج اور جہالت پر قلم کاری کیا کرتی تھیں۔ وہابی خیالات کی خاتون تھیں اور تعویذ گنڈے' قبر پرستی' مزاروں پر حاضری وغیرہ کو مسلم سوسائٹی کے لیے دیمک کی طرح بگاڑ کی وجہ سمجھتی تھیں۔

آپا فرخندہ کی شادی ڈاکٹر ایوب احمد خاں سے ہوئی تھی' جو جنگِ اسپین میں شرکت کر کے اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ انہوں نے ایک بڑی بصیرت افروز کتاب بھی لکھی جس میں Zionists کا پول کھولا اور ایسے ایسے سلوگن ایجاد کیے:

Democracy is demon-cracy

Tis sale money and weapons of war

Which corrodes the nations through.

Axe down the curse of usury!

And the world blooms, with you,

Like the beautious flowers, red and blue.

(The Sages of Ages)

وہ مغربی طاقتوں کا پول کھولنے اور ان کی منافقت سے مشرقی ممالک کو آگاہ کرنے والوں میں بہت پہلے سے واویلا مچا رہے تھے۔ ان ہی کے صاحبزادے جواد احمد خاں ہیں۔ ایوب بھائی آدرشوں سے محبت کرنے والے' لکھنے پڑھنے کی تحریکیں چلانے' اسرائیل کو مسلمانوں کا دشمن سمجھنے والے آدمی تھے۔ جب وہ لندن میں اپنی پڑھائی کے سلسلے میں گئے تو آپا فرخندہ مزنگ روڈ پر منتقل ہو گئیں اور یہیں پر اُن کی بیٹی ناہید اشفاق احمد اور دوسرے بہن بھائیوں کی بہن بن کر پلی۔ اُن سے خاں صاحب کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ ناہید کو شہد سے میٹھی اور چاند سے پیاری جیسے القاب دے کر خط لکھا کرتے تھے۔

آپا فرخندہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں اور اپنی خوبصورتی کے باعث باپ کی لاڈلی تھیں۔ اُن کے لیے نوکرانیاں مقرر تھیں۔ ڈاکٹر صاحب آپا جی کے لیے لاہور سے Pears کے صابن منگواتے تھے۔ ان کے پیروں کو مساج کے لیے اٹلی سے زیتون کا تیل امپورٹ کیا جاتا۔ ہر قسم کی کولڈ اور Vanishing کریمیں گھر میں آتیں حتیٰ کہ بابا جی اپنی ذہانت کے باعث فیسرین کریم بنانے میں کامیاب ہو گئے جو آج بھی مہاسوں' چھائیوں اور دانوں کے لیے

سیکھی جاتی ہے۔ آپا جی کی اولاد میں ڈاکٹر جواد ساجد قابل ذکر ہیں' جو نامور مصری ڈاکٹر مگدی کے دستِ راس رہے اور خود بڑے نامور ہارٹ سرجن ہیں۔ ڈاکٹر جواد احمد اس وقت ہارٹ کے سرجن ہیں اور PIC میں CEO ہیں۔ اُس کے کام کی اتنی شہرت ہے کہ اُسے ہلال پاکستان بھی مل چکا ہے لیکن اُس کا طرۂ امتیاز اُس کے اپنے نزدیک کچھ اور ہے۔

جواد کے آباؤ اجداد کا گاؤں جہان خیلاں ہے جہاں اُن کی ایک بڑی متبرک درگاہ ہے۔ جہان خیلاں ہوشیار پور میں واقع ہے۔ یہ درگاہ سکھوں اور مسلمانوں دونوں کے لیے متبرک ہے۔ ابھی سال بھر پہلے کی بات ہے درگاہ کے سکھ عقیدت مندوں نے جواد کو وہاں مدعو کیا۔ اُس کے ساتھ مل کر درگاہ پر چادر چڑھائی۔ جواد کے سر پر پگڑی باندھی۔ عظمیٰ کے سر پر چادر سے ڈھانپا اور بارڈر تک اُسے چھوڑنے آئے۔ وہ جس فخر سے اس واقعے کا ذکر کر رہا ہے اُس کے سامنے اُس کی ہارٹ سرجری ماند پڑ جاتی ہے۔

آپا فرخندہ کے بعد آپا فرحت کا نمبر آیا۔ دونوں بہنیں لکھنے پڑھنے کی شوقین تھیں۔ بابا محمد خاں چونکہ آپا فرخندہ کو زندگی بھر اولیت بخشتے رہے اور آپا جی ہی کی خاطر انہوں نے فیسرین ایجاد کی اس لیے ایک طرح سے دونوں بہنوں میں Sibling جیلسی کا رشتہ قائم ہو گیا جو ساری عمر آپا فرحت کے لیے احساسِ کمتری کا باعث بنا رہا۔ آپا فرحت حسن میں آپا فرخندہ سے کمتر تھیں۔ اس لیے انہیں گھر پر بی کلاس سٹیزن سمجھا جاتا تھا' لیکن اس درگزری کی وجہ سے اُن میں اصول پرستی اور انصاف طلبی بڑھی اور انہیں پاکستان کی تحریک سے گہری محبت ہو گئی۔ ان ہی آپا جی سے خاں صاحب کا گہرا رشتہ تھا اور وہ ہر وقت ان کا دم چھلا بنے رہتے۔ دسویں جماعت کے بعد وہ ان ہی کے پاس فیروز پور میں منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے ڈی اے وی کالج میں بڑے مشاعرے' مباحثے اور پڑھائی میں توجہ دی۔

آپا جی کے میاں ڈاکٹر عبدالقادر گائے طبیعت آدمی تھے۔ کلینک پر مریضوں کا دم چھلا اور گھر پر آپا فرحت کے کھونٹے سے بندھے رہتے۔ مسلم لیگ کے جلوسوں میں خاں صاحب مائیک پکڑ کر اونچی اونچی تقریریں کرتے۔ آپا جی کو ایک تقریر کے موقع پر قید کر لیا گیا۔ وہ اپنے آدرش کی خاطر خندہ پیشانی سے جیل چلی گئیں۔ یہی پاکستان سے آدرشی محبت دونوں بہن بھائی کو پاکستان ساتھ لے آئی اور اسی کے باعث خاں صاحب نے پورے 39 سال تنقیدِ شاہ لکھا۔

آپا جی کو اپنے بڑے بیٹے جاوید طارق (جو ان دنوں ہائی نون لیبارٹریز کے چیئرمین ہیں) کی بہت فکر تھی۔ جاوید بی اے میں تھا اور پڑھائی سے مکمل طور پر بے پرواہ۔ دائیں بائیں دوستی' یار باشی کا چسکا' وقت کا ضیاع اس کے مشغلے تھے۔ آپا جی نے جاوید کو میری شاگردی میں دے دیا۔ میں اُسے زیادہ تر انگریزی پڑھاتی تھی۔ 1951ء میں اشفاق صاحب اٹلی جا چکے تھے اس لیے آپا جی کے پاس آنے جانے میں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ جاوید جب پڑھنے آتا تو بیشتر وقت اپنا چھوٹا سا کتا ساتھ لے آتا اور نوٹس بنانے کے بجائے صرف زبانی لیکچر سننے پر اکتفا کرتا۔ کتے کو گود میں لے کر پڑھنا اور پھر ناغے بھی کرنا اس کا معمول تھا' لیکن یہی جاوید آگے چل کر ہائی نون لیبارٹریز کا خالق بنا اور میرے بیٹے انیس احمد خاں کو اپنی دامادی میں قبول کیا۔ میں ان دنوں اپنی خالہ فیروزہ کے پاس 60- فیروز پور روڈ میں رہتی تھی۔ جاوید اور ناہید یہاں ہی پڑھنے آتے رہے۔

ان دو بہنوں کے بعد آفتاب بھائی کا نمبر آتا ہے۔ وہ چھ فٹے لمبے دبلے پتلے' لڑکیوں کی طرح شرمیلے' میٹھی

مسکراہٹ اور ہلکی کھلکھلاہٹ والے آدمی تھے۔ وہ کورٹ سے نکلنے کے بعد کبھی کسی کے متعلق تجسس' کھوج نہ لگاتے۔ غیبت جیسے مشاغل سے دور رہتے۔ خاں صاحب کا تعلق جب ایم اے میں مجھ سے پیدا ہوا اور انہوں نے میری تربیت' پرورش اور خود اعتمادی کو سہارے دینا چاہے تو آفتاب بھائی اس محبت میں گپ چپ شامل ہو گئے۔ وہ کبھی کبھی کچہری سے فارغ ہو کر گورنمنٹ کالج کے سامنے والی پٹڑی سے ہو کر اپنے گھر 1- مزنگ روڈ جاتے۔ راستے میں مجھ سے مٹھ بھیڑ ہو جاتی اور ایک ہی ملاقات کے بعد انہیں مزید تعارف کی ضرورت نہ رہی۔ میری والدہ کو وہ آپا جان کہتے تھے۔ جب میرا پہلا مضمون Our Men چھپا تو پہلا تعریفی خط اُن ہی کا تھا۔ جب خاں صاحب اٹلی چلے گئے اور ہم سمن آباد میں منتقل ہوئے تو آفتاب بھائی اور آپا فرحت بھی سمن آباد آ دبکے تھے۔

آفتاب بھائی کے بعد افتخار بھائی اس دنیا میں آئے۔ ان میں بغاوت کا مادہ تھا۔ انہوں نے غالباً اپنے والد صاحب کو چڑانے کے لیے پڑھائی ادھوری چھوڑی اور بی اے نہ کیا۔ جب ڈاکٹر محمد خاں اپنے بیٹوں کو مارتے تو یہی بھائیوں کو چھڑاتے۔ سب سے زیادہ انہوں نے خاں صاحب اور اشتیاق کو چھڑایا۔ وہ انوکھا راستہ' انوکھی بات' انوکھا رویہ اختیار کر کے سب کو چونکا دیتے تھے۔ جب شادی کا مسئلہ چھڑا تو اپنی خالہ کی بڑی بیٹی باجی ضیاء کے ساتھ بیاہ کرنے سے منکر ہو گئے اور چھوٹی بہن آپی منیر کو دلہن بنا لیا۔ فیسرین کا کام والد کی حیاتی میں نہ کیا اور تحسن خان کی زمینوں کی دیکھ ریکھ کرنے چلے گئے۔

افتخار احمد خاں بقول ساری دنیا کے ''ڈیڈی جی'' اونچے لمبے براؤن آنکھوں اور براؤن بالوں والے دیہاتی عادتوں والے ڈیڈی جی بڑے من موہن تھے۔ ہر انسان کا چلتے چلتے باتوں باتوں میں دل چرانے کا فن جانتے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے ڈاکٹر طارق بن افتخار شکاگو میں بڑے نامور آرتھوپیڈک سرجن ہیں۔ یہ وہی ہیں جنہوں نے اشفاق صاحب اور میری وہ تصویریں بنائی ہیں جو آپ ہماری کتابوں کے پچھلے صفحے پر دیکھا کرتے ہیں۔

لیکن بیٹوں کی تعلیم و تربیت کا سہرا ڈیڈی جی کی بیگم آپی منیر کو جاتا ہے۔ ڈیڈی جی اور اقبال بھائی نے اپنی خالہ کی دو بیٹیوں سے شادی کی' لیکن یہاں بھی تھوڑا سا گھپلا ہوا۔ باجی ضیاء بڑی بہن تھیں۔ انہیں اصولاً افتخار بھائی کی بیگم بنایا جانا چاہیے تھا لیکن دونوں بھائیوں نے دونوں بہنوں میں باہمی رضامندی سے اس طرح شادی کی کہ چھوٹی آپی منیر تو بڑے بھائی افتخار سے بیاہی گئیں اور باجی ضیاء کی شادی اقبال بھائی سے طے پائی۔ ڈیڈی جی کو بچپن سے کتوں کا شوق' کھیتی باڑی سے دلبستگی تھی۔ اس کا آپی منیر کو دلی قلق تھا۔

خاں صاحب نے روم سے واپسی پر شادی کا ارادہ کر لیا' تو اس گم سم شہزادے کا کوئی مددگار 1- مزنگ روڈ میں نہ تھا۔ ان دنوں ڈیڈی جی نچلی منزل میں مقیم تھے۔ نہ جانے کیسے انہوں نے بھائی کی مشکل کو بھانپ لیا۔ یا پھر مفتی جی نے انہیں رازداں بنایا۔ وہی میری والدہ تک پہنچے۔ وہی نکاح خواں لائے۔ ان ہی کے دستخط نکاح نامے پر ہوئے۔

455-این سمن آباد میں ہماری شادی بڑی سادگی سے ہوئی۔ میں نے پرانا سفید شلوار قمیض پہنا' خاں صاحب معمولی لکیروں والے کرتے میں ملبوس تھے۔ مفتی جی' محمد حسین آرٹسٹ اور ڈیڈی جی براتی تھے۔ ریزی اور محمودہ اصغر میری والدہ سمیت مائیکہ والے تھے۔

نہ کوئی ڈھولک بجی نہ کوئی مہندی کی رسم ہی ہوئی۔ نکاح کے بعد خاں صاحب نے اپنی پاس بک میرے ہاتھوں میں چپ چاپ تھما دی۔ اس میں نو سو روپے جمع تھے۔ محمودہ اصغر کی شناخت کا ایک حوالہ خالدہ حسین ہے جو اُس وقت چھوٹی تھی۔ خالدہ اصغر تھی۔ محمودہ اور خالدہ انجینئرنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اصغر صاحب کی صاحب زادیاں تھیں۔

اس شادی کی خبر جب پھیلی تو بابا جی نے خاں صاحب کو کچھ نہ کہا۔ البتہ افتخار بھائی اور آپی جی کو گھر سے نکال دیا۔ اپنا بوریا بستر اُٹھا کر اپنے بچوں سمیت ڈیڈی جی میری خالہ کے پاس 450-این سمن آباد آ گئے۔ آپی جی بڑی ہمت والی ساتھ نبھانے والی خاتون تھیں۔ اُن کے بیٹے طارق، حارث اور عدنان کریسنٹ ماڈل سکول میں پڑھتے تھے۔ آپی جی نے بڑی محبت کا ثبوت دیا۔ اپنے بیٹے طارق کو میری گود بٹھا کر گود بھرائی کی رسم ادا کی اور اس طرح طارق بن افتخار میرا متبنیٰ بن گیا۔ یہ نبھانے والے لوگ ہیں۔ طارق نے رسم کی لاج رکھی اور آج تک اُس نے اپنے چچا اور میری ایسی عزت اور محبت کا مظاہرہ کیا جو اس رسم کی یاد دلاتا رہتا ہے۔

کچھ دیر تک ڈیڈی جی اور آپی میری خالہ کے پاس رہے۔ اتنا بڑا حادثہ یا واقعہ رونما ہوا۔ گھر بدری کے باوجود آپی نے ہمت نہ ہاری اور بچوں کو اسی زور شور سے پڑھاتی رہیں جیسے وہ ا۔ مزنگ روڈ پر کمر بستہ رہتی تھیں۔ میری خالہ بھی بچوں کو حساب پڑھانے میں آپی جی کی مدد کرتی رہیں۔

اور جب کچھ عرصہ بعد قتیل شفائی کے پڑوس میں ڈیڈی جی 427-این ٹائپ میں منتقل ہو گئے تو آپی جی بچوں کی تعلیم کی طرف اور بھی مستعد ہو گئیں۔ وہ بچوں کو بڑے جوش و خروش سے پڑھاتیں۔ محبت اپنی جگہ وہ مکے، گھونسے اور ٹھڈے مارنے سے بھی دریغ نہ کرتیں۔ میں آپی جی کے اس پہلو سے بہت متاثر تھی۔

میں نے بھی کہیں اندر یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ اولاد ہونے پر خود انہیں تعلیم دوں گی، لیکن ایم اے پاس ہونے کے باوجود معمولی ایف اے پاس آپی منیر کا میں مقابلہ نہ کر سکی کیونکہ مجھ میں نہ وہ ڈسپلن تھا نہ میں سائنسی علوم ہی سے واقف تھی نہ پڑھانے کے علم سے آگاہ۔ آپی نے بچوں کو علم میں خود کفیل کر دیا۔ میں نے بچوں کے ہوم ورک خود کر کے انہیں اپنے اوپر انحصار کرنے کا طریقہ سکھا دیا۔

اس کی وجہ میری شخصیت کا نقص ہے جس کا علم اب مجھے حاصل ہوا۔ میں خدمت کر کے اپنا جھنڈا بلند کرنا چاہتی ہوں۔ میری شخی مجھے یہ سوچنے کا موقع نہیں دیتی کہ میں اُس شخص کی فلاح کا سوچ سکوں جس کی مدد کرنے پر میں مصر ہوتی ہوں..... خیر!

میں اور خاں صاحب روز شام کو آپی جی اور ڈیڈی کے گھر جاتے۔ وہاں کھانا کھاتے۔ اُن کی بڑی بیٹی لبنیٰ مجھ سے بہت مانوس ہو گئی تھی اور کبھی کبھی میرے ساتھ سو جاتی تھی۔

مکتسر میں اقبال بھائی ایک طور پر بابا جی سے بغاوت پر آمادہ رہتے، لیکن اتنی ہمت نہ تھی کہ کبھی بھی منہ در منہ بحث کر سکتے۔ افتخار بھائی کی طرح انہیں بھی پڑھائی سے نفرت تھی۔ اقبال بھائی خاں صاحب سے مشابہہ بڑی من موہنی شخصیت کے مالک ہیں۔ اُن کے گرد حسیناؤں کا گھیرا رہتا۔ انہیں لوگوں کی توجہ لینا مشکل نہ تھی۔ گھر کی مامائیں، سہیلیں، مہریاں سب اُن کی بات جلدی مان لیتیں۔ سب سے پہلے اُن کے کپڑے دُھلتے۔ اُن کا بستر جھاڑا جاتا۔ انہیں لسی

ایسی دی جاتی جس میں مکھن کا پیڑا تیرتا۔ اسی وجاہت کے باعث وہ جلد اپنی خالہ زاد باجی ضیاء کی آنکھ کا تارا بن گئے۔

اسحٰق بھائی بھائیوں میں ماسٹر مائنڈ تھے۔ انجینئر طبع سوچ اور عمل کے بندے تھے۔ اُن کے متعلق کچھ کہانیاں سب بہن بھائی اپنے اپنے رنگ میں سناتے ہیں۔ مکتسر میں ٹیلی فون صرف ڈاک بنگلے میں تھا۔ یالدھارام کے گھر تھا جو ہندو سیٹھ تھا اور کاٹن کا بزنس کرتا تھا۔

حسن اتفاق سے اس ٹیلی فون کی تار باباجی کے گھر سے گزرتی تھی۔ ججو بھائی کے دل میں سمائی کہ گھر کے اُوپر سے گزرنے والی تار پر ذاتی تار پھینک کر ٹیلی فون اپنے مصرف میں لایا جاسکتا ہے۔ اب ٹیلی فون کی تار کا مسئلہ اُٹھا۔ مکتسر سے کوٹ کپورہ سات میل دُور تھا۔ وہاں ٹیلی فون کی تار ملنے کے امکانات تھے۔ اس کام کے لیے خاں صاحب کو چنا گیا کیونکہ ججو بھائی کا خیال تھا کہ ان کا چہرہ بھولا بھالا ہے۔ کوئی تار کے متعلق سوال جواب نہ کرے گا۔

سکول سے فرار ہو کر خاں صاحب کوٹ کپورہ پہنچے۔ بڑی مشکل سے تار چرائی اور گھر آئے۔ اب ججو بھائی نے اوپر گزرنے والی تار پر کانٹی مار کر اپنی تار کا Connection لگایا۔ لیجیے چرایا ہوا فون اور کھسکائی ہوئی تار کامیاب رہے اور لدھارام کی دکان سے فون مل گیا۔ اب فون پر کپاس کی خرید و فروخت اور روئی کے بھاؤ آنے لگے۔

اسحٰق بھائی نے سوچا کہ بم بنانا چاہیے۔ اس بم کا مصرف کیا ہوگا۔ یہ انہوں نے نہ سوچا۔ ایک طبعی سائنسدان کی طرح انہیں صرف بم کی ایجاد سے غرض تھی۔ اب گھریلو بم کے لیے مچھل پٹاس اور پارے کی ضرورت تھی۔ مچھل پٹاس تو بازار سے مہیا کی جاسکتی تھی لیکن پارہ کمیاب بھی تھا اور اس کے خریدنے کی پسلی بھی نہ تھی۔ سکول میں سائنس لیبارٹری میں قریباً دو سیر پارہ پڑا تھا۔

اب یہ سوچنا تھا کہ پارہ وہاں سے کیسے اُڑایا جائے؟ بڑے بھائیوں سے بات چیت مشکل تھی۔ اشتیاق ابھی چھوٹا اور بے سمجھ تھا۔ طے یہ ہوا کہ خاں صاحب اوورکوٹ پہن کر جائیں اور پارہ لیبارٹری کی بوتل سے چرا کر کوٹ کی جیب میں ڈالیں اور گھر لے آئیں۔

جب شفو اوورکوٹ پہن کر سکول پہنچے تو سب حیران کہ اتنی گرمی میں یہ کوٹ کیوں؟ بہانہ بھی پہلے تراش کر دیا گیا تھا۔ خاں صاحب نے سب سے کہا کہ ملیریا بخار ہے بہت سردی لگ رہی ہے۔ مشکل سے لیبارٹری تک رسائی ہوئی۔ پارہ کوٹ کی جیب میں ڈال کر چوروں کی طرح باہر نکلے۔

دو ڈھائی سیر پارے کی وجہ سے ایک سائیڈ جھکی ہوئی تھی۔ بہرکیف جیسے کیسے پارہ اوپر والے کمرے میں جہاں سائنسی تجربہ گاہ تھی، پہنچایا گیا۔ ججو بھائی نے مچھل پٹاس، پارہ اور جانے اور کیا اجزاء ملا کر ایک چھوٹا سا تجرباتی بم تیار کر لیا گیا۔ بدقسمتی سے یہاں ہی کبوتروں کی چھوٹی چھوٹی کابکیں تھیں۔ ماچس کی خالی ڈبیا میں ایک چھوٹا سا بم بنا کر رکھ دیا گیا۔

یہ بھائی مزے لے لے کر غلط انفرمیشن بہم پہنچاتے۔ لدھارام علیحدہ پریشان۔ ڈاک بنگلے میں کسی نہ کسی افسر کی آمد کی اطلاع دیتے، کمرے بک کرا دیتے، متعلقہ افسر کبھی نہ پہنچ پاتا۔ ڈاک بنگلے کے کارندے بسترے تولیے تبدیل کر کھانا وانا پکا کر منتظر رہتے۔ یہاں تک تو خیر ذہانت کی چمتکار دکھانا مقصود تھا، لیکن ایک اور سائنسی تجربہ خطرناک صورت اختیار کر گیا۔

واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اوپر والی منزل میں چھوٹی چھوٹی کابکیں بابا جی کے کبوتروں کے لیے تھیں۔ ان میں کبوتر لمبی اُڑانوں کے بعد بسرام کرتے۔ ان کابکوں کو صاف کرنے پر ملازم مامور تھا۔ ججو بھائی کا تجرباتی بم ایک کابک میں چھپایا گیا تھا۔ جس وقت طوطی ان کابکوں کو صاف کر رہا تھا تو اُس نے ماچس کو گندی چیز سمجھ کر اپنے پیروں سے دوفٹ دور پھینکا۔ یوں تو شاید بم دیر تک پڑا رہتا اور کسی کو خبر تک نہ ہوتی.....

اب جو اسے زور سے فرش پر دے مارا تو بم فعال ہوا اور اس نے یہ کرتب دکھایا کہ طوطی کے دائیں پاؤں کا انگوٹھا اُڑ گیا۔ لہو کی دھار ناک تک پہنچی۔ طوطی نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ بابا جی کوٹھے پر بھاگے آئے۔ مرہم پٹی کرنے کے بعد سب بچوں کو لائن اپ کرلیا۔ ایسی قرار واقعی سزا دی کہ سب کی سٹی گم ہوگئی۔ نانی اماں ہاتھ جوڑتی پھریں۔ اماں جی نے بچوں کی طرف سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافیاں مانگیں لیکن بابا جی نہ مانے۔ اوپر کے کمروں تک اسحٰق، اشفاق اور اشتیاق کی رسائی بند ہوگئی۔

لیکن اس سزا کا سارا فائدہ بچوں ہی کو پہنچا۔ خاں صاحب اپنی ادبی سرگرمیوں کی طرف متوجہ ہوگئے اور ججو بھائی کو بھی ادبی خمیر لگا دیا۔ تقو پیدائشی ایتھیٹ تھا۔ وہ کھیلوں کی طرف راغب ہوگیا اور یوں ان تینوں کو اپنی صلاحیتوں کا سراغ مل گیا۔

اشتیاق اپنی فوجی صلاحیتوں کو بھانپ کر فوج میں چلا گیا۔ اسحٰق بھائی کو ہوائی جہازوں نے متاثر کیا اور وہ ہوائی فورس میں بھرتی ہوگئے، لیکن جب وہ سکواڈرن لیڈر تھے تو اچانک نوکری چھوڑ کر مزنگ روڈ آ بسے۔ واپسی کا چکر اُن کی بیوقوفی کی صلاحیت اور اُپج تھی۔ وہ فیسرین کریم کو نیا Get up اور خوبصورتی عطا کرنا چاہتے تھے۔ اس کا لیبل ماڈرن کرنے کے آرزومند تھے۔ یہ میری شادی سے بہت پہلے کی باتیں ہیں۔

ججو بھائی یہ جانتے ہوئے بھی کہ بابا جی پورے آمر ہیں انہوں نے مغربی ممالک کی کریم ساز کمپنیوں سے رابطہ قائم کیا۔ ان میں نیویا، الزبتھ آرڈن، کی نائیٹ اور ویٹنگ کریم پیش پیش تھیں، لیکن بابا جی پرانے خیالات کے تھے۔ وہ کسی مارکیٹنگ کی خاطر نہ تو فیسرین کی شیشی بدلنا چاہتے تھے اور نہ اس کا لیبل ہی۔ اس دوغلی حکومت میں انجام کار دونوں ہی ناخوش ہو کر رہ گئے۔

پھر اماں جی سردار بیگم اور اسحٰق بھائی کی بیگم ذکیہ جی میں بھی خیالات کے ٹکراؤ کی فضا پیدا ہوگئی۔ مزنگ روڈ میں کسی قسم کا تہوار، سالگرہ، عیدیں منانے کا رواج نہ تھا۔ ذکیہ جی نے واصف کی سالگرہ بڑے دھوم دھڑکے سے منائی۔ بابا جی تو خیر شریک ہی نہ ہوئے۔ اماں جی موجود تو رہیں لیکن شریک نہ ہوئیں۔ اس سرد جنگ کے نتیجے میں ججو بھائی نے بوریا بستر باندھا اور میسن روڈ پر واقعہ ایک بنگلے میں جا بسے۔

یہاں ایک نئے ماحول میں ججو بھائی نے نیوسیما کریم ایجاد کی۔ اس کی مارکیٹنگ کے لیے کوشاں رہے لیکن ایک غیبی مشیت ایزدی بھی ہوا کرتا ہے۔ نیوسیما نہ چل سکی۔ ذکیہ جی ایک ایسی باحوصلہ بیوی تھیں جس نے ہر جگہ پر کام میں اسحٰق بھائی کا ساتھ دیا۔ نیوسیما کریم بنانے، پیک کرنے میں ساتھ لگی رہی۔

جب نیوسیما فیل ہوگئی تو یہ میاں بیوی کینیڈا چلے گئے۔ شادی سے پہلے ذکیہ جی نے ہال روڈ پر واقعہ منگر کے

سکول سے سلائی اور کشیدہ کاری کا کورس کیا تھا۔ جب یہ دونوں کینیڈا پہنچے اور روزگار کی تلاش ہوئی تو ذکیہ جی نے اسی کورس کا فائدہ اٹھا کر وہ سلائی کی کہ دلہن کا سفید لباس سینے پر جلد ہی مامور ہو گئیں۔ وہاں بھی ججو بھائی نے نیو سیما بنائی' لیکن مقابلہ سخت رہا اور یہ کریم مسابقت کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔

بچپن میں خاں صاحب اور تقوا اپنے رنگ لیڈر ججو بھائی کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ اقبال بھائی کی شرارتوں میں شریک رہتے تھے۔ آفتاب بھائی سے فاصلے پر مؤدب رہ کر اُن کی عزت کیا کرتے تھے۔ اُن کی بہنوں نے انہیں گوودوں کھلایا تھا۔ اُن سے رشتہ چھوٹی امی کا سا تھا۔

بچپن میں جب اُن کے کانوں میں پٹھانوں کی روایات اور رسم و رواج کا چرچا پڑا۔ انہیں معلوم تھا کہ پٹھانوں کے دو قبیلے ہجرت کر کے پنجاب میں وارد ہوئے تھے۔ نیازی قبیلہ ہوشیار پور میں قیام پذیر ہوا۔ ان میں عمران خاں نے نیازی قبیلہ کا نام روشن کیا۔ یہ لوگ مہمند قبیلے سے زیادہ پڑھے لکھے اور فارغ البال تھے۔ مہمند قبیلے نے جالندھر میں پڑاؤ ڈالا اور ان کی شہرت کا باعث اشفاق احمد بنے۔

باباجی ضلع فیروز پور میں مکتسر آ گئے۔ یہ سکھوں کا ایک مقدس قصبہ ہے۔ ان کے ایک گرو یہاں مقیم رہے۔ مکتسر کے لفظی معنی مکتی کا تالاب ہے۔ امرتسر میں امرت کا تالاب ایک بہت متبرک جگہ مانی جاتی ہے۔ باباجی نے اپنے سارے بچے میونسپل بورڈ سکول میں داخل کروائے لیکن شاید اپنی شناخت کی فکر میں شقو جی کو اسلامیہ دینی مدرسہ میں داخل کرا دیا۔

یہ سکول مسجد میں قائم تھا۔ یہاں ہی خاں صاحب نے بچپن ہی میں بہت سے دینی مسائل رٹ لیے۔ اس سکول میں ٹاٹوں پر بیٹھتے۔ قلمیں گھڑ کے دوات میں کپڑے کا سوف ڈال کر کالی سیاہی بنا کر قلم سے لکھا جاتا۔ خاں صاحب کو تختی پر لکھنا' تختی کو دھو کر گاچنی مل کر صاف کرنے کے لیے سکھانا بڑے تخلیقی عمل لگتے۔

پھر نہ جانے کن وجوہ کی بنا پر پانچویں جماعت میں خاں صاحب کو بھی انگریزی سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ سرکاری سکول میں پہنچتے پہنچتے خاں صاحب کے پاس تقابلی مطالعے کا مواد بہم ہو گیا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ انگریزی پڑھنے والوں میں ایک خاص قسم کا تکبر تھا اور وہ مقامی لوگوں کو ہیچ سمجھتے تھے۔ انہیں تجربہ تھا کہ اُن کی دائی ماں کا بیٹا مسجد سکول میں اُن کے ساتھ پڑھتا تھا اور اُس کی خطاطی بہت خوبصورت تھی اور شقو جی اُس سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

خاں صاحب کے گھر میں ایک ملازم بھینسوں کی دیکھ ریکھ پر مقرر تھا۔ وہ دور سے آتی ہوئی بھینس کو دیکھ کر بتا دیتا کہ بھینس کس کی ہے اور آٹھویں مہینے میں ہے اور اس بار کٹا دے گی۔ پھر جب اگلے مہینے بھینس کٹا دیتی اور اُس کی پیشانی پر ویسا ہی سفید داغ ہوتا جس کی پیش گوئی ملازم کر چکا ہوتا' تو شقو جی حیران نہ ہوتے۔

بادلوں کو دیکھ کر بارش کے متعلق جو کچھ ملازم بتاتے عموماً ٹھیک نکلتا۔ چھوٹی عمر میں خاں صاحب اس حقیقت سے دوچار ہو گئے کہ پڑھے لکھوں کا علم اپنی جگہ لیکن دانش و فراست میں تجربے اور زندگی سے سیکھنے کے عمل میں ان پڑھ بھی اپنا ایک جداگانہ علم اور مقام رکھتے ہیں۔

دسویں مکتسر سے کرنے کے بعد خاں صاحب اپنی بہن آپا فرحت کے پاس فیروز پور چلے گئے۔ یہاں پر آپا جی کے شوہر ڈاکٹر عبدالقادر پرائیویٹ پریکٹس کرتے تھے۔ شروع میں تو ان کی فیس چار آنے تھی اور پریکٹس میں بڑی دقت

پڑھتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی انسان دوستی اور اخلاق نے رنگ دکھایا۔ ڈاکٹری کا دھندا چل نکلا۔

خاں صاحب کو فیروز پور میں رام سکھ داس کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ یہاں اُن کی نصابی کارکردگی تو نہ چمکی لیکن خوبصورتی، جامہ زیبی، طرحداری کی وجہ سے ہم جماعت طالب علموں میں ان کا نام اُبھرنے لگا۔ ان ہی دنوں اُن میں شاعر کروٹ لے کر بیدار ہوا جو پھر نثر کی طرف مڑ گیا اور پھر لمبا چکر کاٹ کر اردو بورڈ سے ریٹائرمنٹ کے بعد پنجابی نظم کی شکل میں بیدار ہوا۔ وہ شاعری جو رام سکھ داس کالج میں جاگی اور ساری جوانی سلیپنگ بیوٹی کی طرح سوئی رہی، کروٹ لے کر ''کھٹیا وِچ'' کی شکل میں دوبارہ بیدار ہوئی۔

سنا ہے جب وہ بی اے میں تھے تو کالج میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ خاں صاحب کالی شلوار قمیض میں بیرونوں پر پہنچے اور اپنی غزل پڑھ کر مشاعرہ لوٹ لیا۔ اس غزل کا ایک شعر جو سارے کالج میں زبان زدِ عام ہوا یہ تھا:

ع کہکشاں بن گئی ہر راہگذر آج کی رات

لیکن گورنمنٹ کالج پہنچ کر جو کچھ ہوا وہ تو آپ تک ہولے ہولے ہی پہنچ پائے گا۔

تقو بیچارہ نہ تین میں تھا نہ تیرہ میں۔ بڑے بھائیوں کا ٹولا اُسے قابلِ اعتنا نہ سمجھتا تھا۔ اسحٰق بھائی اور شتو جی سے ساتھ ساتھ لیے پھرتے لیکن اُس کی حیثیت کنجی برادر کی سی تھی۔ دراصل خاں صاحب اور تقو کے درمیان ایک بیٹا اور بھی بابا جی کو عطا ہوا تھا۔ وہ دو سال کا ہو کر اللہ کو پیارا ہوا۔ اس کا کے کو اشتیاق ''کالی بھونڈی'' کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ خاں صاحب پورے چار سال تقو سے بڑے تھے۔ وہ اور چھوٹے بھائی تقو کو ساتھ ساتھ رکھتے لیکن جب وہ صبح کو ملٹر کے تالاب میں نہانے جاتے تو تقو کو سوتا چھوڑ جاتے۔

تقو کو اس بے وفائی پر بہت ملال تھا۔ وہ خاں صاحب کے ساتھ سویا کرتا تھا۔ تقو نے بالآخر یہ ترکیب سوچی کہ رات کو اس وقت تک جاگتا رہتا جب تک شتو جی سو نہ جاتے۔ پھر وہ کمال آہستگی سے اپنا ازار بند خاں صاحب کے کمر بند سے باندھ دیتا۔ شتو جی جب تالاب پر جانے کے لیے اُٹھتے تو ازار بند کی کھینچ پڑتے ہی تقو جاگ جاتا۔

اب بڑے بھائی تقو کو ساتھ لے جانے پر متامل ہوتے لیکن تقو دھمکی دیتا کہ اگر مجھے ساتھ نہیں لے جائیں گے تو میں بابا جی کو جگا دوں گا۔ مارے باندھے تقو کو ساتھ لے جانے لگے اور بہت جلد تقو ان دونوں سے بہتر تیراک بن گیا۔

یوں تو ہر شخص پر بچپن کی چھاپ گہری ہوا کرتی ہے لیکن خاں صاحب اپنے اس آبائی وطن کو کبھی نہ بھولے۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر وہ کہیں اور پروان چڑھے ہوتے تو شاید اُن کی تخلیقی قوتوں کو یوں پنپنے کا موقع نہ ملتا۔ وہ ساری عمر اپنے اسی بچپن کی شکر گزاری میں مبتلا رہے جس نے انہیں کچھ باتیں ذہن نشین کرا دیں۔

وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ بچپن میں عام انسان کے اس قدر قریب نہ رہے ہوتے تو وہ کبھی سمجھ نہ پاتے کہ غریب آدمی کا بنیادی مسئلہ ضروریاتِ زندگی کی فراہمی ضرور ہے لیکن سب سے بڑا مسئلہ ''عزتِ نفس'' ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر عام آدمی کو روٹی، کپڑا اور مکان میسر آ جاتا ہے لیکن وہاں عزتِ نفس نہیں ملتی تو وہ بظاہر زندہ رہتا ہے لیکن اندر سے مر جاتا ہے۔

اُن کا یقین کامل تھا کہ پاکستان کا خواب دراصل اسی خواہش کی تکمیل کے لیے دیکھا گیا تھا کیونکہ 1947ء سے پہلے اونچی ذات کا ہندو اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتا تھا اور اس کے نزدیک ہندوستان کی باقی ساری جاتیاں شودر

تھیں۔ مسلمان تو خاص طور پر ایسے ملیچھ تھے جن کے برتنوں میں کھانا پینا' اپنا مذہب بھرشٹ کرنے کے مترادف تھا۔ ہر حکومت' تحریک' سیاست کا بنیادی مسئلہ دراصل عزت نفس کی بحالی ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب نعرہ بازی ہے۔ پتہ نہیں وہ اپنے نظریے میں حق بجانب تھے بھی یا نہیں؟

ان آٹھ بہن بھائیوں کے ساتھ آپا فرخندہ کی سب سے بڑی بیٹی ناہید بھی مزنگ روڈ میں ہی پلی بڑھی اور پروان چڑھی۔ خاں صاحب اُس سے بہت محبت کرتے تھے۔ ناہید کی شادی جہلم میں پرائم گلاس فیکٹری کے سانجھے مالک رشید احمد خاں سے ہوئی۔ اُس کے چار بچے ہیں۔ بڑی بیٹی ربیقہ بڑی صالح روح ہے۔ وہ عورت کی نو حاصل کردہ آزادی اور مذہب کی حدود کے امتزاج کو اعتدال سے سمجھ گئی ہے۔ حجاب بھی پہنتی ہے اور جہلم میں انگریزی میڈیم سکول کی منتظم بھی ہے۔ گاڑی بھی چلاتی ہے۔ اے لیول' او لیول کی تیاری بھی کراتی ہے لیکن آزادی کے ہمراہ بے راہ روی کو اپنے اُوپر جائز نہیں سمجھتی۔

ایک بیٹی ثانیہ جو ماں کی طرح آرٹسٹ نکلی۔ وہ اپنے شوہر کے ہمراہ کینیڈا جا بسی۔ مغربی ماحول نے اُسے صیقل کیا۔ وہ اپنی تصویروں کی نمائش لگاتی ہے۔ فرانس جرمنی جا کر اُس نے اپنے کام کی بدولت بڑا نام پیدا کر لیا ہے۔

ایک بیٹا میمون رشید اور اُس کی من موہنی بیوی ازکا لاہور میں سیٹل ہو گئے ہیں اور بڑی خاموشی سے ایک بڑی کمپنی کے کرتا دھرتا ہیں۔

لیکن ناہید کی اصل وجہ شہرت ڈاکٹر حسنات احمد خاں ہیں' جو غالباً آج کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ حسنات اور ڈیانا کی محبت اب پبلک پراپرٹی ہے۔ اس پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ کئی پروگرام ٹیلی ویژن پر بھی آ چکے ہیں' جن میں ایک انٹرویو خاں صاحب کا بھی بڑی شہرت حاصل کر چکا ہے۔

میں نے تعارف کے طور پر آپ کو خاں صاحب کے گھر والوں سے ملا دیا ہے۔ اس گھر میں جا بجا چراغ' فانوس' شمعیں' روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ خاں صاحب کے علاوہ اس گھرانے میں طارق بن افتخار جیسے قابل سرجن ہیں جو انٹرنیشنل فوٹو گرافر بھی ہیں۔

جس طرح جواد ساجد نے آپا فرخندہ اور ڈاکٹر ایوب کا نام روشن کیا اور جیسے آپا فرحت کے بیٹے جاوید نے دوائیوں کی دنیا میں تہلکہ مچایا' ایسے ہی ڈاکٹر طارق بن افتخار نے بڑی انٹرنیشنل شہرت پائی ہے۔ دو سال پہلے جب باغ میں زلزلہ آیا تو طارق اپنے ساتھ کچھ امریکی سینٹر لے کر باغ پہنچا۔ سینٹر تو رفاہی کاموں میں مصروف ہو گئے لیکن طارق نے ان گنت ہڈیاں جوڑیں..... لیکن خاندان میں اس کا چرچا نہ کیا۔ وہ کامیاب بھی ہے اور بڑا انسان بھی..... یہ دونوں خوبیاں ایک ہی انسان میں کم کم ہوتی ہیں۔

اور پھر حسنات ہے۔ وہ بھی بنیادی طور پر بچوں کے دل کا آپریشن کرتا ہے اور لندن میں اُس کی شہرت کا ڈنکا بجتا ہے۔

میں نے خاں صاحب کے خاندان اور اُن کے چیدہ چیدہ مشہور آدمیوں کو آپ سے اس لیے روشناس کرایا ہے

تھے ان لوگوں کی محبت میں گندھے ہوئے تھے۔

اشفاق صاحب نے دنیا کمائی تو بیوی بچوں کے لیے لیکن یقین جانئے وہ دنیا سے وابستہ نہیں ہوئے۔ وہ ہمیشہ قصے کی غلام گردشوں میں پھرتے رہے۔ ایک مدت انہوں نے رشتے ناطوں کو اپنا سرمایہ سمجھا۔ خاں صاحب کو سمجھنے کے لیے کسی وقت بھی یہ دھاگے ہاتھ سے چھوڑے نہیں جا سکتے۔ گو آخر میں غالباً وہ بھی جان گئے تھے یہ سب بتانِ وہم وگماں ہیں مگر اُن کی تلاش کا راستہ اور جانب جا نکلا تھا لیکن ان رشتوں کی اہمیت کو سمجھے بغیر ایک قاری اشفاق احمد کی تصویر میں لگی ہوئی گراؤنڈ کو نہیں سمجھ سکتا!

اسی لیے میں نے اُن کا شجرۂ نسب بھی ساتھ نتھی کر دیا ہے کیونکہ یہ نام، یہ رشتے جا بجا آئیں گے، کبھی کبھی تواتر کا حصہ بنیں گے، کبھی دوہرائی بات دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت ہوگی لیکن کیا کیا جائے زندگی ہمیشہ سیدھی لائن کا سفر نہیں کرتی۔ کبھی کبھی اس کا سفر دائرے کا بھی ہوتا ہے۔

محمد مستقیم خاں (ہجرت کر کے آنے والے)

↓

محمد معظم خاں

↓

دوست محمد خاں

↓

بابا محمد خاں + بی بی سردار بیگم

1. آپا فرخندہ (ڈاکٹر ایوب کی اہلیہ) 20 مئی 1912ء
2. جناب آفتاب احمد (سرکاری وکیل) 20 مئی 1912ء
3. آپا فرحت (زوجہ ڈاکٹر عبدالقادر) 16 مئی 1916ء
   - جاوید طارق خاں
   - وسیم خاندہ
   - ندیم کی والدہ
   - ↓
   - جاوید طارق خاں ہائی نون لیبارٹری
   - اشفاق صاحب کے سمدھی
   - ثویلہ بیٹی سے جناب انیس احمد خاں کی شادی ہوئی
4. افتخار بھائی 18 مئی 1918ء (نخشن خاں کی زمینوں پر کھیتی باڑی اقبال بھائی کے سمدھی ڈاکٹر طارق بن افتخار سرجن کے والد)
5. اقبال بھائی (بابا محمد کے ٹرسٹ کے امین۔ نخشن خان) 20 مئی 1920ء افتخار بھائی کے سمدھی
6. اشفاق احمد خاں 18 مئی 1922ء
7. اشفاق احمد خاں 22 اگست 1925ء
8. اشتیاق کالی بھونڈی (عمر دو سال)
   - ↓
9. ریٹائرڈ بریگیڈیئر اشتیاق احمد خاں (کور کمانڈر) 1929ء

لیڈی میکلیگن کالج سے ساندہ کلاں تک

قیامِ پاکستان کے بعد فضا ابھی ایسی باتوں سے بوجھل تھی جن سے مسلمانوں کے ناآسودہ سوالات' اُن کی بے چارگی کی کہانیاں اور چھوڑے ہوئے گھروں کے Nostalgia کی خوشبو آتی تھی۔ کچھ لوگ بہادر تھے جو جملہ قربانیوں کو اس ملک کے قیام کے مقابلہ میں ہیچ سمجھتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جنہیں پچھلے گھر' آبائی وطن' وہاں کے موسم' رہن سہن' دوست احباب بھولے نہ بھولتے تھے۔ وہ پاکستان میں رہتے ہوئے یہاں کی نعمتوں سے فیضیاب ہونے کے باوجود سدا دن پانی کے پودے کی طرح سسکتے رہتے۔ کچھ ایسے لوگ تھے جو ابھی بین بین چل رہے تھے۔ کبھی نئے وطن کی عافیت اور راحت کے شکر گزار ہوتے' کبھی پچھلی یادوں میں ڈوب کر گلہ گزار بن جاتے۔

کئی پشتوں سے اشفاق صاحب کا گھرانہ تعلیم یافتہ اور سیاست سے وابستہ رہا تھا۔ خاں صاحب کی بڑی بہن آپا فرحت نے جدوجہد پاکستان میں بڑا عملی حصہ لیا تھا۔ تقریریں کی تھیں۔ قائداعظمؒ کے مؤقف کو پاکستان کی اہمیت کو لوگوں تک پہنچانے میں ریڑھوں پر چڑھ چڑھ کر مخاطب کیا تھا اور اس کے نتیجے میں جیل بھی بھگتی تھی۔

جب لوگ نعرے لگاتے ''پاکستان کا مطلب کیا؟''

تو خاں صاحب اُن کے ساتھ مل کر جواب دیتے ''لا الٰہ الا اللہ۔''

پھر وہ مجمع کو دونوں ہاتھوں سے شانت کرتے اور اپنی تقریر کرتے جس میں ایک ہی بات پر زور ہوتا کہ پاکستان میں لوگ وسائل کے حصول کے لیے دیوانہ وار نہیں بھاگیں گے۔ چونکہ معاشرہ اسلامی اقدار پر قائم ہوگا اس لیے انصاف کی بنیاد پر قائم کیا جائے گا' لیکن سب سے بڑی بات پاکستان میں یہ ہوگی کہ اس دیس میں سب کی عزتِ نفس محفوظ ہوگی۔ وہ ذلت جو ہندو اکثریت کے ہاتھوں مسلمانوں کا نصیب تھی' اب ایسی ذلت سے کوئی مسلمان دوچار نہیں ہوگا۔

وہ جانتے تھے کہ قائداعظمؒ نے جداگانہ حق خودارادیت کے لیے بہت کوشش کی۔ وہ صرف اس قدر چاہتے تھے کہ جس علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو وہاں سے اُن ہی کا نمائندہ منتخب کیا جائے۔ پنڈت نہرو چودہ نکات پر مشتمل تجاویز پر کلی طور پر متفق تھے لیکن پھر اسی سے منکر ہو گئے..... قائداعظمؒ نہ دھرنا مارتے تھے نہ جھگڑا کرنے کے قائل تھے نہ

جیل جا کر وقت ضائع کرنے کے ہی شوقین تھے۔ انہیں آئینی جنگ جیتنے کا خیال رہتا۔ انہوں نے مسلمان اقلیت کو ایک نئے ملک کا سندیسہ دیا جس میں جا کر یہی اقلیت راتوں رات اکثریت میں بدل جائے گی۔

خاں صاحب پر قائداعظمؒ کی تعلیمات اور ترغیبات کا بڑا گہرا اثر پڑا تھا۔ انہوں نے زندگی بھر نہ کبھی دھرنا اختیار کیا نہ بآواز بلند احتجاج کیا' نہ کبھی اپنے قلم کو مزاحمتی ادب کی طرف راغب کیا۔ وہ اپنے میں توانائی' تقویت' خودارادیت اور لگن پیدا کرتے اور بڑی ثابت قدمی سے استقامت کے ساتھ منزل کی طرف چلتے رہتے۔

اُن کا ہیرو گاندھی نہیں تھا۔ وہ کبھی کبھی سوال کرتے کہ مہاتما گاندھی تو فلسفہ عدم تشدد کے پیروکار تھے۔ اُن کے چاہنے والوں نے سرکار انگلشیہ کی لاٹھیاں کھائیں' آنسو گیس کے ہاتھوں روئے' لیکن پلٹ کر ایک پتھر روڑا بھی ان مظالم توڑنے والوں پر نہیں پھینکا۔ پھر یہی ہندو جنتا جس کا "اہنسا" پرچارک مسلک تھا' مسلمانوں کے خون سے کیوں داغ دار ہوا؟ ان کے ہاتھوں مسلمان خواتین کی عصمتیں کیوں داغدار ہوئیں؟ بہار کے مسلمانوں پر جب تشدد ہوا تو مہاتما گاندھی نے زبان کیوں نہ کھولی؟ وہ بہار کے مسلمانوں کی دلجوئی کے لیے کیوں نہ پہنچے؟ اس معاملے میں اُن کا فلسفہ عدم تشدد کیوں خاموش رہا؟ پھر جب پنڈت جواہر لعل نہرو اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں خود جا کر کشمیریوں کا حق ارادیت مان آئے تھے تو پھر ہندوستان نے اس وعدے کا پاس کیوں نہ کیا؟ شیخ عبداللہ کو میر جعفر کا جیتا جاگتا روپ دے کر اُسے کشمیر پر مسلط کیوں کیا؟ کشمیریوں کی جنگ آزادی کو بغاوت کا نام دے کر اس پر فوج کشی کیوں کی؟ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ساز باز کر کے گورداسپور کا علاقہ جہاں مسلم اکثریت تھی' ہندوستان کے حوالے کیسے کر دیا؟

گلی کوچوں میں' وائٹن کیمپ میں جہاں جہاں رفیوجی پڑاؤ ڈالے بیٹھے تھے' کہانیاں خون آشام تفاصیل سے داغدار گھوم پھر رہی تھیں۔ تیج بہادر سپرو' مظہر علی خاں' علی برادران' حسرت موہانی ابھی زندہ ہیرو تھے' لیکن اس آدرشی گفتگو کے ساتھ دنیاوی مسائل حل کرنے کی ضرورت بھی بہت اہم تھی۔ مقامی انصار کی پُرجوش مدد ناکافی تھی۔ لوگ مالِ غنیمت سمیٹنے' تالے توڑنے' گھروں پر ناجائز قبضہ جمانے کا شعار بھی اپنائے ہوئے تھے۔ روزگار کا کچھ ٹھیک نہ تھا۔ حکومت ابھی استوار نہ ہوئی تھی۔ روزمرہ کے مسائل' مادی ضرورتیں' صبح و شام کے مسائل بھولے نہ بھولتے۔

اسی فضا میں جو تضاد تھا' نیکی اور بدی کی جو آمیزش تھی' گندے اور صاف لہو کا بیک وقت دل میں رہنے سے جو آری ہر وقت لوگوں کے اندر چلتی تھی' اس سے خاں صاحب بھی مستثنیٰ نہ تھے۔

خاں صاحب کا خاندان لُٹا پٹا پاکستان پہنچا۔ باباجی اس چھوٹے سے قافلے کے سربراہ تھے۔ باباجی کے چھ بیٹے اور دونوں بیٹیاں ساتھ تھیں۔ بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اتنے سارے لوگ کہاں سے کھائیں گے؟ کہاں سوئیں گے؟ ایسے میں یہ لوگ یہ سارا لاؤ لشکر ماڈل ٹاؤن پہنچا۔

یہاں 96-ڈی ماڈل ٹاؤن میں اماں جی سردار بیگم کی بہن رشیدہ بیگم کے ساتھ رہتی تھیں۔ اُن کے شوہر بھائی فیاض پولیس میں آئی جی تھے۔ ماسی رشیدہ کا رشتہ گو بہن کا تھا' لیکن ماسی رشیدہ ہمیشہ اماں جی کو اپنی ماں جائی سمجھتی تھیں۔ نانی اماں جو باباجی کے قافلے کے ساتھ آئی تھیں' عجیب صابر شاکر عورت تھیں۔ انہوں نے کبھی زندگی سے کوئی توقعات وابستہ نہ کی تھیں۔ عین جوانی میں اُن کا شوہر ایک گائے کو ساتھ لے کر کوئٹہ چلا گیا' لیکن انہوں نے کبھی شوہر کے خلاف

بن کھولی۔ آپا فرخندہ کے شوہر ڈاکٹر ایوب احمد خاں لندن میں تھے اور آپا جی نے کبھی نہ پوچھا تھا کہ اُن کی واپسی کب ہوگی۔ بھائی ایوب ایف آر سی ایس کرنے کی غرض سے لندن گئے تھے لیکن وہاں سے وہ ہسپانیہ کی جنگِ آزادی میں بھرتی ہو گئے لیکن آپا فرخندہ نے کبھی کوئی سوال نہ اپنے سے نہ کسی سے پوچھا۔ آپا فرحت کے شوہر ڈاکٹر عبدالقادر ان دنوں سیالکوٹ میں تھے اور وہیں آپا فرحت بھی چلی گئیں۔

کچھ دیر تو اماں جی اپنے کنبے کے ساتھ ماڈل ٹاؤن میں رہیں، لیکن پھر انہیں پتہ چلا کہ موج دریا کے قریب مزنگ روڈ پر ایک ڈھنڈار سا تین منزلہ مکان پڑا ہے۔ کوئی اس کا والی وارث نہیں۔ اس وقت جب لوگ کوٹھیوں کے تالے توڑ رہے تھے یہ لوگ ۱۔ مزنگ روڈ پہنچے جس کے سارے دروازے کھڑکیاں چوپٹ کھلے تھے۔ اینٹیں جا بجا بکھری تھیں۔ پانی کے نل سوکھے اور بجلی کے میٹر غائب تھے۔ ایسے میں یہ لٹا پٹا کنبہ یہاں پڑاؤ ڈالنے پر مجبور تھا۔ حالانکہ رشتہ داروں نے اماں جی پر تہمت لگائی کہ انہیں یہاں سے ایک سیف ملا جس میں لاکھوں کی نقدی تھی، لیکن افواہ، گمان اور شک تو مشرقی معاشرے کا ضمیر ہیں۔ ہم لوگ ان ہی تین جذبوں کے تحت اخبار بینی کا شوق پالتے ہیں اور غیبت کے چسکے لیتے ہیں۔

آفتاب بھائی سرکاری وکیل تھے، لیکن ابھی ان کا کچہری سے رابطہ استوار نہ ہوا تھا۔ اقبال بھائی نے باندی روٹی چلانے کے لیے ایک انوکھا روزگار تلاش کیا۔ وہ بکر منڈی سے بکرا خریدتے، اسے اپنے مضبوط کندھوں پر سوار کرتے۔ دن بھر اسے بیچنے کے لیے گاہک تلاش کرتے اور پھر جب بکرا بک جاتا تو پیسے اماں جی کی ہتھیلی پر لا کر رکھتے۔ ان کی اس ترکیب سے سب کو روٹی میسر آ جاتی۔ بابا جی روز صبح انارکلی جاتے۔ یہاں بیلی رام کی دکان تھی۔ اس تاجر بچے نے بابا جی سے بہت ادھار لے رکھا تھا۔ بابا جی کی آرزو تھی کہ کچھ رقم انہیں مل جائے لیکن دکان بند تھی اور ادھار ملنے کے کوئی آثار نہ تھے۔

کھکھو بھائی جنہیں سب ڈیڈی جی کہتے تھے، ادھر اُدھر نوکری تلاش کرنے کی بے سود کوشش کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ "داستان گو" کے دفتر سے بھی چھٹی لی جائے اور بخشن خاں جا کر بابا جی کی زمینوں کی جمع بندی پر توجہ دی جائے اور ان اراضی سے جو روپیہ حاصل ہو اُسے خاندان کی بحالی میں لگایا جائے، لیکن ابھی یہ سکیم بھی سرے نہ چڑھ سکی اور وہ بے کار صورت گھر والوں پر بوجھ بنے رہے۔

اشتیاق سب سے چھوٹا تھا۔ اُس سے کوئی توقع نہ کی جا سکتی تھی لیکن اُس نے کشمیر فرنٹ پر جانے کا پروگرام بنا لیا۔ اماں جی اندرونی زخموں سے نڈھال تھیں اور ویسے بھی "تقو" چھوٹا ہونے کے ناطے انہیں سب سے پیارا تھا لیکن تب مسلمان مائیں بچوں کو جہاد فی سبیل اللہ سے نہ روکتی تھیں۔ یہ جہاد نفس کی شکل میں ہوتا یا کسی فرد یا معاشرے کے حقوق بحال کرنے کے لیے پیش آتا، بخوشی اجازت مل جاتی۔ اسی جذبے کے تحت تقو آزاد کشمیر سدھارا اور غازی بن کر لوٹا۔

خاں صاحب کی مشکل اُس وقت سامنے آئی جب وہ متواتر محکمۂ روزگار کے دفتر جاتے اور ناکام لوٹتے۔ ایک روز خاں صاحب نے وہاں ایک مہربان صورت کلرک سے پوچھا "بھائی! میں روز آتا ہوں۔ آپ بغیر کسی وعدے کے لوٹا دیتے ہیں۔ آخر وجہ کیا ہے؟"

کلرک تھوڑی دیر زیرِ لب مسکرایا۔ پھر بولا "جناب! آپ کے پاس بی اے کی ڈگری ہے اور ہمیں دسویں پاس درکار ہے۔ بی اے پاس نہ تین میں نہ تیرہ میں....."

''یہ تو آسان سا مسئلہ تھا۔ آپ میری دسویں کی ڈگری رکھ لیں اور مجھے نوکری دے دیں۔''

کلرک بادشاہ نے خاں صاحب کو والٹن کیمپ میں جونیئر کلرک کی آفر دی۔ اُن کی تنخواہ 65 روپے ماہانہ تھی۔ انہیں والٹن کیمپ میں مائیکروفون پر گم شدہ رشتہ داروں کے پیغامات بے گھروں' گم شدہ لوگوں تک براڈ کاسٹ کرنا تھے۔ خاں صاحب صبح ایک پوٹلی میں دو روٹیاں' اچار یا کچھ بچا کھچا سالن لے جاتے اور رات تک اس پر گزارہ کرتے۔ کچھ راستہ تو بس لے جاتی۔ باقی وہ پیدل چلتے۔ نہ کبھی وہ کوئی حرف شکایت منہ پر لائے' نہ کبھی اپنی Contribution ہی پر شیخی ماری۔ اس طرح کی شیخی اُن کے گھر میں حرف ممنوع تھی۔

یہیں انہیں ممتاز مفتی ملے جو اس یونٹ کے کرتا دھرتا تھے۔ وہ مہاجروں کی مشکلات کو رقم کرتے' ان کے حل تلاش کرتے اور ہر روز افسرانِ بالا کو رپورٹ کرتے۔ مفتی جی اور خاں صاحب کی دوستی Instant کافی کی طرح تھی..... فوراً تیار۔ فوراً استعمال کے قابل.....

دونوں ادیب تھے۔ دونوں لوگوں کے ہمدرد تھے۔ دونوں کو عادت تھی کہ توجہ کی سرچ لائٹ اپنے تک نہ آنے دیتے۔

میری والدہ' بھائی پرویز چٹھہ اور میں گورداسپور سے ہجرت کر کے لاہور پہنچے تھے۔ ہمارے دل میں گورداسپور چھوڑنے کا بڑا قلق تھا۔ کیونکہ ہم اطمینان سے اس اُمید پر بیٹھے تھے کہ گورداسپور مسلم اکثریت کا علاقہ ہے یہ تو یقیناً پاکستان کا حصہ بنے گا' لیکن سیاسی جھوٹ تو سیاست کا ناگزیر حصہ ہوا کرتے ہیں۔ اصل حقیقت برسوں بعد چھان پھٹک کر سامنے آتی ہے جب اس سچ کا فائدہ کچھ نہیں ہوتا۔

گورداسپور میں ہمارا گھر اُس سڑک پر واقع تھا جو پٹھان کی طرف جاتی تھی۔ اس گھر کا کالا پھاٹک عین سڑک پر کھلتا۔ پھر بائیں جانب چھوٹا سا کچن گارڈن تھا' جس میں پودینہ' دھنیا' گاجریں' کھیرے اور دو چار بوٹے بیریوں کے نظر آتے۔ دوسری طرف ایک لیٹرین اور اُجاڑ صورت جگہ تھی جس کی دیکھ ریکھ کے لیے کسی کے پاس وقت نہ تھا۔ دونوں باغیچوں میں لمبا راستہ آگے چل کر ایک ڈیوڑھی میں کھلتا جس کے آگے پھر پھاٹک تھا اور اس کے دائیں بائیں دو کمرے تھے۔

ایک کمرہ تو ملازموں کے لیے مختص تھا اور دائیں جانب مہمان خانہ تصور کیا جاتا۔ اس کے بعد ایک کھلا صحن تھا جس میں بائیں ہاتھ باورچی خانہ تھا' جس میں ہمارا خانساماں چراغ دین کام کرتا تھا۔ وہ عادتاً کام چور اور ویسے بھی چور تھا۔ تمام مراعات ملنے کے باوجود وہ ہیرا پھیری سے باز نہ آتا۔ ایک روز جب اُسے میری والدہ نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تو وہ طیش میں آ کر بولیں ''چراغ! میں بیوہ ہوں۔ میں نے بڑی مشکل سے بچے پالے ہیں۔ میری دعا تو پتہ نہیں لگتی ہے کہ نہیں لیکن میری بددُعا تمہیں ضرور لگے گی۔''

جب ہم لیڈی میکلیگن میں مقیم تھے تو ایک دن میری والدہ کو چراغ مانگتا ہوا انارکلی میں ملا۔ میری والدہ کو پہچان کر بولا ''بی بی جی..... یہ میری آنکھیں نہیں گئیں آپ کی بددُعا لگی ہے..... دیکھتی ہیں.....''

میری امی کئی دن پشیمان صورت پھرتی رہیں لیکن یہ بھی نیک لوگوں کے عمل کا ایک خاص منفی قسم کا اجر ہے۔

تو میں آپ کو گورداسپور کے گھر کے متعلق بتا رہی تھی۔ باورچی خانے اور صحن کے عین سامنے تین بڑے کشادہ کمرے غسلخانوں سمیت بنے تھے۔ ایک میں میری والدہ اور میں رہتے تھے اور دوسرے کمرے میں میرا بھائی ریزی رہا کرتا تھا۔ لاہور میں جس روز بی ایتھس کے اے کورس کا پرچہ تھا کنیئرڈ کالج کے پچھواڑے آگ لگ گئی۔ ممتحن اعلیٰ نے سب لڑکیوں سے پرچے اکٹھے کیے۔ ہمیں ایف سی کالج پہنچایا اور وہیں ہم کنیئرڈ کی لڑکیوں نے باقی پرچے دیے۔ امتحان دے کر میں اور ریزی افراتفری میں گورداسپور پہنچے۔ امی انسپکٹرس آف سکولز تھیں' لیکن حالات کے پیش نظر انہوں نے کچھ دن کے لیے دورے منسوخ کر دیے تھے۔

گورداسپور ہندوستان کا حصہ بن گیا۔ ہندو اکثریت ڈسٹرکٹ تک راہداری مل گئی۔ گورداسپور کی مسلم آبادی جان بچانے کو گرودوارہ پتن کی طرف جانے لگی۔ میرے بھائی کے دل میں پاکستان کے تصور سے عمق محبت تھی۔ ایک روز اس نے باہر جانے کے لیے باغ کا گیٹ کھولا تو چند بے آسرا غریب لوگوں کو ننگی تلواروں سے قتل کرنے کے عزم میں چند سکھ ٹوٹ پڑے۔ ریزی نے پھاٹک کھول کر ان چند نفوس کو اندر دھکیلا اور گیٹ لاک کر دیا۔ ریزی کی یہ عملی مدد اس وقت بھی جاری رہی جب ہم عافیت کے ساتھ لاہور پہنچ چکے تھے۔ وہ قافلوں کی مدد کرنے کے لیے بسوں پر آیا کرتا۔ جو کچھ اس سے بن پڑتا کرتا۔ اس وقت جب سب لوگ جان بچانے کی فکر میں تھے' یوں جان ہتھیلی پر رکھ کر قافلوں کے ساتھ آنے جانے کی ہمت وفا میں نے صرف ریزی میں دیکھی۔ وہ اسی طرح جان چھڑکنے والوں میں شمار ہوا کرتا تھا۔

گورداسپور اب ہمارا گھر ایک طرح سے رفیوجی کیمپ بن گیا۔ ان لوگوں میں ایک زینب تھی جو پٹیالہ کے کسی تحصیلدار کی بیوی تھی اور جو بہت بعد میں کئی برس ہمارے گھر کھانا پکانے پر مامور رہی۔ اس کے ساتھ اس کا چھوٹا سا بیٹا ٹانو تھا اور جب میں 24۔ایس کینال میں تھی' تو یہی ٹانو میرے ساتھ کالج جایا کرتا تھا۔

شاید ہم پتن والے گھر سے نکلنے کا نہ سوچتے اگر ایک واقعہ نہ ہو جاتا۔ ہمارے گھر سے عین ملحق بائیں جانب ایک کھلی سی گراؤنڈ اور آرمی افسروں کی چند بیرکیں تھیں۔ یہاں ان دنوں رونق تھی۔ پریڈ کی آواز بھی آتی تھی اور بگل بھی بجا کرتا تھا۔ ایک روز چراغ لمبا سا چہرہ لے کر میری والدہ کے پاس آیا "بی بی! ایک بات ہے..... اب یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ آپ بوریا بستر سمیٹیں اور لاہور چلیں۔"

"لیکن وجہ....."

"وجہ یہ ہے جی....." اس نے رازداری سے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

"میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے جی۔ ساتھ والے فوجی افسر بات کر رہے تھے۔"

"کیا بات کر رہے تھے فوجی افسر؟"

"وہ جی کیسے عرض کروں وہ کہہ رہے تھے کہ چھوٹی بی بی کو اغوا کر کے بیرکوں میں لے جائیں گے۔"

"کیا کیا کیا....." امی گڑبڑائیں

"ہاں جی وہ تو اور بھی بڑی پلید باتیں کر رہے تھے جی....."

وہ تو یہ کہہ کر چلا گیا' لیکن امی سٹ پٹا گئیں۔ پاکستان آنے کا فیصلہ آناً فاناً ہو گیا۔ جب محافظ ہی لومڑی صفت

ہوں تو حفاظت کیا معنی.....کونوائے کبھی کا جا چکا تھا۔ امی نے اپنا تمام اثر و رسوخ لگا کر ایک ٹرک لیا۔ اس میں وہ چند رفیوجی چڑھائے جو ہمارے گھر میں مقیم تھے۔ مجھے ایک رضائی میں لپیٹ کر ڈرائیور کے پیچھے والی روک کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ حکم تھا کہ کسی قیمت پر بھی رضائی سے باہر سر نکال کر جھانکنا نہیں ہے۔ میرے بھائی کے پاس دھرمسالے کی ایک ڈیزی گن تھی' جس سے وہ پرندے پھڑکایا کرتا تھا۔ اسی گن کو تو اُس نے ''جھاکے'' کے طور پر تھوڑا سا چھت سے نکال کر سارا سفر کسی فوجی کی سی مستعدی سے طے کیا۔

دو چار مرتبہ ٹرک کو راستے میں روکا گیا' لیکن عافیت گزری اور ہم بالآخر یونیورسٹی کیمپس پہنچے۔ یہاں یونیورسٹی بند تھی۔ ہم نے یونیورسٹی کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر روٹی کے ساتھ کریوں کا اچار کھایا جو چراغ کی عقیدت سے ساتھ چلا آیا تھا۔

لاہور شہر ہمارے لیے اجنبی تھا اس لیے ہماری والدہ نے اپنی بہن فیروزہ خالہ کے گھر کو تلاش کیا۔ وہ لئے پٹے لاہور کی مین فیروز پور روڈ پر رہتی تھیں۔ یہ گھر مسز گیلانی کا تھا' جو سکول میں پونا ماچھا (خالہ فیروزہ) کے نیچے پڑھاتی تھیں۔ ہم ان کے گھر پہنچے۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ میری والدہ کو لیڈی میکلیگن کالج کی پرنسپل بنا دیا گیا۔ یہ کالج اساتذہ تیار کرنے کی درس گاہ تھی۔ یہاں جے وی اور بی ٹی کی سندیں حاصل کر کے لڑکیاں پڑھانے کے قابل ہو جاتی تھیں۔

اس کے ساتھ ہی انڈر ٹریننگ ٹیچرز کے عملی کام کے لیے ایک باقاعدہ سکول بھی تھا' جس میں دسویں تک جماعتیں تھیں۔ ایک اور اضافی کام یہاں یہ جاری ہوا کہ سکول میں مہاجر لاوارث چھوٹے بچوں کا کیمپ بھی کھول دیا گیا۔ یہاں بچوں کو مالی' طبی امداد دینے کے بعد ان کے وارثین کی تلاش کی جاتی یا پھر بچوں کے آرزومند والدین کے حوالے کر دیا جاتا۔

کالج سے ملحق پرنسپل لاج تھا۔ کالج کا احاطہ ختم ہوتے ہی ایک بڑی پختہ دیوار تھی' جس میں ایک دروازہ کالج اور پرنسپل لاج کے درمیان کھلتا تھا۔ اس دروازے کو صرف پرنسپل لاج کی طرف سے زنجیری کنڈی لگ سکتی تھی۔ پرنسپل لاج دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصے میں پرنسپل اور دوسرے حصے میں ہیڈ مسٹریس رہا کرتی تھیں۔ قیام پاکستان کے دوران امریکن پرنسپل مس رائس واپس چلی گئیں اور ہیڈ مسٹریس بھی غائب ہو گئیں۔

اب پورا پرنسپل لاج ہمارے قبضہ قدرت میں تھا۔ میرے بھائی اُن دو کمروں میں منتقل ہو گئے' جو ہیڈ مسٹریس کے لیے مختص تھے' لیکن وہ ان کو استعمال نہ کرتے تھے۔ ایک چھوٹا کمرہ جس کا دروازہ برآمدے میں تھا' اسے گودام بنا لیا گیا۔ ریزی بھائی ہمارے ساتھ ہی کھاتے پیتے اور سوتے تھے۔ لمبے سے برآمدے کے پیچھے تین بڑے کمرے تھے۔

دائیں طرف پہلا کمرہ ڈائننگ روم' پھر ڈرائنگ روم' آخر میں بیڈ روم۔ اس کے ساتھ ڈریسنگ روم اور غسل خانے کے علاوہ ایک گودام سے مشابہ ایک اور کمرہ تھا' جس میں غیر ضروری چیزیں پڑی رہتیں۔ ہمارا زیادہ وقت برآمدے میں گزرتا تھا۔ یہاں کالج کی پروفیسریں' لڑکیوں کے والدین اور لواحقین' فسادات میں بچھڑے ہوئے ملاقاتی آتے رہتے۔

برآمدے کو آپ ایک طرح کا Visitors روم کہہ لیجئے۔ یہاں پاکستان کے حالیہ مسائل' سرکاری افسران کی مشکلات اور عوام کی بے چارگی' سیاست کے الجھاؤ' وسائل کی کمی اور نہ جانے کیا کچھ زیر بحث آتا۔ ابھی امن کی وہ شکل پیدا

تھی جہاں پہنچ کر لوگ گھروں کی زیبائش، فرد کے لباس اور بچوں کی تعلیم کے پیچھے دیوانہ وار مسابقت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ابھی دولت کی پوجا سے لوگ قریب قریب ناآشنا تھے۔

میری والدہ کو کالج کی مشغولیات مصروف رکھتیں اور وہ زیادہ وقت اپنے دفتر اور سٹاف روم میں گزارتیں۔ میرے بھائی ریزی ابھی تک اپنے سوشل ورک میں مصروف تھے۔ وہ کبھی امرتسر سے مہاجروں کے کنوائے لاتے۔ کبھی جالندھر اور لدھیانے کی طرف سے آنے والی لاوارث سی بسوں کے ساتھ ہوتے۔ ریزی بھائی نے کبھی اپنے سفروں میں اپنے لیے کوئی انتظام نہ کیا تھا۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی وہ سارا دن کے بھوکے پیاسے گھر پہنچتے۔ اُن کے ساتھ سفروں کی کئی کہانیاں ہوتی تھیں، لیکن میری والدہ کے پاس ان کو سننے کا وقت نہ تھا۔

میں ویسے ہی کھلنڈری طبیعت کی مالک تھی۔ جب تک مسئلہ میرے جبڑے میں گھونسے مار کر مجھے متوجہ نہ کرے میں پریشان نہیں ہوتی۔ مجھے بھی ریزی کی کہانیوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ مجھے اپنا دل لگانے کے لیے پروفیسران میں بڑا بہت راستہ مل گیا تھا۔

کالج کی جانب پختہ دیوار میں بنے ہوئے دروازے کو میں کھولتی اور کالج کے اوقات کے بعد ہاتھ میں بیڈمنٹن کٹ لے کر کالج میں چلی جاتی۔ عین پرنسپل ولا سے ملحق بیڈمنٹن کے کورٹس تھے۔ یہاں عموماً میرے ساتھ کوئی نہ کوئی کھیلنے پر آمادہ مل جاتا۔ پرنسپل کے دفتر اور پی اے کے کمرے سے ملحقہ دو کمرے سٹاف کی رہائش گاہ تھے۔ یہاں میں رات کا کھانا کھا کر چلی جاتی اور یہ پروفیسران کچھ مجھے پرنسپل کی بیٹی سمجھ کر اور کچھ وقت کی خاطر میری دوستی کا دم بھرتی تھیں۔

ان میں سب سے پیش پیش جمیلہ ظفر تھیں۔ یہ میری ہم عمر، ہم مزاج اور ہم مشغلہ ساتھی بن گئیں۔ جمیلہ کا مزاج ٹھنڈا میٹھا تھا۔ ان کا خاندان بھی مہاجر تھا۔ بہن بھائی سب راولپنڈی میں تھے۔ رات گئے تک ہم باتیں کرتے ناچنے گانے کا شوق پالتے۔ اُن دنوں مجھے گانے کا اس قدر شوق تھا کہ آپی ملک نے میرا نام ''کوئل'' رکھ دیا تھا، جو وقت کے ساتھ ساتھ صرف ''کو'' میں بدل گیا۔

جمیلہ ظفر کی شادی کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر زیدی سے ہوگئی جو ایک بہت بڑے ہارٹ اسپیشلسٹ تھے۔ بدقسمتی سے زندگی نے وفا نہ کی اور جمیلہ بیوہ ہوگئیں.....! لیکن یہ بہت بعد کی باتیں ہیں۔ تب ہماری دوستی میں تیز چشمے کا سا بہاؤ تھا۔ اسی جوش کے تحت ہم نے کالج کے ہال میں ایک ناچ کو مرتب کیا جس میں میں نے زندگی کا رول کیا اور جمیلہ نے موت کا روپ دھارا۔

اس ٹیبلو نما ناچ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ زندگی چاہے کیسی ہی کیوں نہ اترائے، کدکڑے مارے بالآخر موت اُسے سر کر لیتی ہے۔ جب کالج میں ڈرامہ ہوا تو ہمیشہ کی طرح میں نے ڈرامہ ڈائریکٹ کیا اور اسی میں یہ ناچ زندگی اور موت کے نام سے دکھایا گیا۔ جمیلہ سے میرا رابطہ ساری زندگی رہا۔ گو ہم دونوں رہینِ غم روزگار رہے لیکن ایک دوسرے کو طاقِ نسیاں میں رکھ کر بھولے بھی نہیں۔

دوسری دلآویز شخصیت اقبال ملک تھیں، جنہیں ہم سب آپی ملک کہتے تھے۔ یہ وائس پرنسپل تھیں اور عمر میں ہم سے بڑی تھیں۔ بڑی شفیق، سادہ طبیعت اور کام کر خاتون تھیں۔ وہ خود تو میرے اور ٹوٹو کے مشاغل میں حصہ نہ لیتیں، لیکن

بڑی گرم جوشی سے تالیاں بجانے والوں میں شامل رہتیں۔

آپی ملک نے ساری عمر شادی نہ کی۔ پہلے وہ لیڈی میکلیگن کالج میں پڑھاتی رہیں۔ پھر ملتان میں گورنمنٹ کالج کی پرنسپل بن گئیں جہاں اُن دنوں میری والدہ انسپکٹر آف سکولز تھیں۔ ملتان میں میری والدہ نے زمینوں کے چکر میں پھنس کر استعفیٰ دینے کی کوشش کی تو آپی ملک وہ واحد رکاوٹ بن گئیں جنہوں نے انہیں استعفیٰ دینے نہیں دیا۔ امی کا ارادہ لینڈ لارڈ بننے کا تھا۔ وہ برج جوزا کی پیدائش تھیں۔ یہ عموماً بہت خیال پرست ہوتے ہوئے تو ام بچوں کی صورت ہمیشہ تضاد اور دوئی کا شکار رہتے ہیں۔ مگر آپی کے پاس ایک طرح سے امی کا گھر ہی بن گیا تھا۔ وہ زمینوں سے لوٹتیں تو آپی کے پاس ٹھہرتیں..... دورے سے آتیں تو اپنے گھر میں قیام کرنے کے بجائے سیدھا آپی کے پاس چلی جاتیں۔

یہ باتیں بہت بعد کی ہیں۔ اس وقت یہ سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ آپی ملک ملتان چلی جائیں گی۔ ابھی تو وہ وائس پرنسپل تھیں۔ ہمارے میں جمیلہ آپی ملک کے علاوہ یہاں ایک اور معتبر پروفیسر امینہ ملک تھیں۔ دراز قد گوری چٹی کشمیری خاتون جن کی شادی بعد میں ادیب شفیق الرحمن سے ہوئی۔ اللہ نے انہیں بڑے خوبصورت دو بیٹے عطا کیے جن میں سے ایک بیٹے کا نیک انجام نہ ہوا اور اس کی خودکشی کے بعد شفیق الرحمن بھی زندہ نہ رہ سکے..... لیکن ابھی یہ بکھیڑے قضۂ قدرت سے منظر عام تک نہ آئے تھے۔ امینہ آپا بیڈمنٹن سے لے کر گانا بجانا' پارٹی' ڈراموں میں شمولیت اور گپ بازی کی شوقین تھیں۔ ایک بار جب سکول میں مغل اعظم کا ڈرامہ سٹیج کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو انہیں شہزادہ سلیم بنانے کی تجویز ہوئی۔

میرے ساتھ خصوصی رعایت ہوا کرتی تھی اس لیے مجھے نور جہاں کا رول دیا گیا۔ افسوس چند ریہرسلوں کے بعد یہ ڈرامہ پتہ نہیں کیوں بغیر سٹیج کیے ڈراپ سین کو پہنچ گیا' لیکن عجیب بات تھی کہ ہمارا گروپ ملال آشنا نہیں تھا۔ جو ہو گیا وہ بھی ٹھیک' جو نہ ہو سکا وہ بھی قابل قبول۔

اس گروپ میں ایک شخصیت انور کی بھی تھی۔ انور آرٹ کی پروفیسر تھیں اور ان کے والد سے میری والدہ کی جان پہچان تھی۔ انور رشید کے والد ملتان کے ڈی سی تھے اور ان ہی نے سب سے پہلے میرے بھائی کو اس کی خدمات کے عوض سات مربعے سرکاری زمین کے الاٹ کیے تھے اور پھر میری والدہ ان ہی مربعوں کی وجہ سے ناوے کے چکر میں پھنس گئی تھیں اور انہوں نے پورے تیس مربعے الاٹ کرا لیے تھے۔

لیکن ابھی انور صرف سوئی تھی اور گروپ میں چینی کی طرح حلول کیے ہوئے تھی۔ وہ نہ بیڈمنٹن کھیلتی تھی نہ ناچتی گاتی تھی۔ اسے اپنی بہنوں کی طرح ڈراموں میں شرکت کا شوق بھی نہ تھا۔ پھر بھی کوئی محفل اس کے بغیر مکمل نہ تھی۔

یہ باتیں بیان کرنے سے فقط یہ بتانا مقصود ہے کہ میں کیسی بے فکری کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں' لیکن میری والدہ یقیناً میرے لیے پریشان تھیں۔ جسے میں خوش وقتی سمجھ رہی تھی اسے وہ تعطل سے تعبیر کر رہی تھیں..... ایک روز ہمارے گھر زبیدہ آپا آ گئیں۔ غالباً وہ لاہور کے ڈی سی کی بیگم تھیں اور امی سے کسی تقریب میں ملی ہوں گی۔ لمبے برآمدے میں آپا زبیدہ بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ وہ لاوارث بچوں کا سروے کرنے آئی تھیں۔ اس وقت میں کالج کی طرف سے ریکٹ لے کر وارد ہوئی۔ شاید میں لان میں بنے ہوئے ٹیوب ویل کا معائنہ کرنے چلی جاتی لیکن امی

نے مجھے آواز دے کر بلا لیا۔

''یہ میری بیٹی قدسیہ ہے.....''

آپا زبیدہ نے میرے سلام کا جواب خندہ پیشانی سے دیا۔

''آؤ بیٹھو.....کیا کرتی ہے؟''

امی نے تعارف کرایا ''بی اے کیا ہے' کنیئرڈ کالج سے۔ بے چاری کی فسٹ ڈویژن ماری گئی۔ بڑی افراتفری میں امتحان دیا ہے۔ اب کوئی ڈھنگ کا بندہ مل جائے تو بیاہ ڈالوں.....''

پتہ نہیں کیوں آپا زبیدہ جھنجھلاہٹ سے بولیں ''ایویں شادی کرا دیں گی۔ چھوٹی سی ہے..... پہلے اسے ایم اے کرنے دیں آرام سے.....کیا عمر ہے اس کی؟''

''انیس سال.....'' امی نے بتایا۔

''ناں ناں مسز چٹھہ ناں ایسا ظلم نہ کریں۔ پلیز.....اسے ایم اے کرنے دیں۔ شادی کونسی بھاگی جاتی ہے۔ ذرا میچور ہو لینے دیں.....ساری عمر پڑی ہے شادی کے لیے.....''

اگر آج کا عہد ہوتا تو زبیدہ آپا ضرور تحریک Feminism کی سرگرم کارکن ہوتیں۔ ابھی عورتوں کی جاگرتی کی لہر پھیلنے والی تھی اور کوئی عورت بھی زنانہ حقوق کی علمبردار بن کر آواز نہ اٹھاتی تھی۔

''اچھا ایم اے تو کرا دوں لیکن کنیئرڈ کالج میں تو صرف بی اے تک تعلیم ہے.....''

''کنیئرڈ کالج کیوں؟ گورنمنٹ کالج بھیجیں۔ وہاں ایم اے اردو شروع کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میں نے داخلہ لے لیا ہے۔ پطرس بخاری سارا کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اچھی پڑھائی ہو گی۔ آپ بے فکر رہیں۔''

امی کچھ متذبذب ہو کر بولیں ''لیکن جب یہ کنیئرڈ میں پڑھتی تھی تو اس کے ریاضیات کے پروفیسر سرداری لعل کہا کرتے تھے کہ اسے ایم اے Mathematics کرنا چاہیے۔''

''مس متھائی کہتی تھیں امی کہ میں اکنامکس میں ایم اے کروں۔'' میں نے اضافہ کیا۔

''چلو جی اس بات کو جانے دیں مسز چٹھہ.....وہ پاکستان سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اب تو اردو قومی زبان ہے..... پاکستان حقیقت ہے۔ ہم نے انگریز اور ہندو کی غلامی سے آزادی حاصل کی ہے۔ آپ تو خود بڑی Educationist ہیں۔ محب وطن ہیں۔ مہاجروں کی خدمت کرتی ہیں۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ اردو کے بغیر پاکستانی کی شناخت ممکن نہیں.....وطن کا تصور اردو سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم نے سندھ میں سندھی' بلوچستان میں بلوچی' پنجاب میں پنجابی اور صوبہ سرحد میں پشتو کو اولین جگہ دی تو ہماری شناخت بھی اتنے ہی حصوں میں بٹ جائے گی۔''

''نہیں بابا! تو بات کو کہاں سے کہاں لے گئی.....مجھے تو صرف اس قدر فکر ہے کہ گورنمنٹ کالج میں Co-education ہے اور.....میں.....''

''جی جی کیسا فکر؟''

''اس نے جب بی اے کا امتحان دیا تو بڑے مشکل حالات تھے۔ جس روز کاکی کا حساب کا پرچہ تھا کنیئرڈ کالج